ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No3,2024

لکھنوی زبان اور اس کا لہجہ: تنقیدی جائزہ

عثمانیہ سلطانہ
پی ایچ۔ڈی سکالر، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد ارشد اویسی
صدر شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Absract:

"Dabistan-Likhnow" means the method of Literature which has been adopted by Old Poets of Likhnow and it is different from the Literuture of Delhi. "Dabistan-Delhi" means Inner and emotional Presntation and "Dabistan-Likhnow" means Outer matters off human and words presntataion in Literature.

Main Poets of Likhnow are; Ghulam HamadaniMushafi, Sheikh QalandarBukhskJura,at, Saadatyar Khan Rangeen, Insha Allah hanInsha,KhwajaHaider Ali Aatish, Sheikh Imam BukhshNasikh, Meer Hassan Dehlavi, PanditDyashankarNaseem, NawabMirzaShouq etc.

کلیدی الفاظ:

دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ، معاملہ بندی، خارجیت، شوکتِ الفاظ، شکوہِ الفاظ، صنعت گری، شعبدہ کاری، رعایتِ لفظی یا ضلع جگت، تشبیہ، استعارہ، فارسی تراکیب، بلاغت، انشا پردازی۔

زبان کا مرکز وہ ہوتا ہے جس جگہ اصلاحِ زبان کی صلاحیت موجود ہو۔ اردو زبان کو خصوصیت سے دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں میں مرکزیت حاصل ہوئی، اس لیے ان کی زبان ٹکسالی زبان کا درجہ رکھتی ہے:

> "زبان کا مرکز ہونا صرف اس امر سے متعلق ہے کہ کس جگہ اصلاحِ زبان کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جب تک دہلی کو یہ اہلیت حاصل تھی اس وقت تک اس کو مرکزیت حاصل رہی لیکن اس کے بعد اس شرف سے محروم ہو گئی اور لکھنؤ کو انھیں خصوصیتوں کی وجہ سے مرکزیت کا درجہ مل گیا۔"(۱)

یہ امر مسلّمہ ہے کہ خواص اور عوام کی زبان میں امتیاز پایا جاتا ہے جب کہ خواص کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ یہ امر دہلی والوں پر صادق آتا ہے مگر لکھنؤ میں خواص و عوام کی زبان میں یکسانیت کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں خواص و عوام دونوں کی زبان ہی مستند ہے:

> "اس میں شک نہیں کہ خواص عوام کی زبان میں فرق ہوتا ہے اور خواص ہی کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے لیکن زبان کی ترقی اس کا نام ہے کہ عوام کی زبان بھی فصیح ہو جائے۔ یہ شرف دہلی کو کبھی نصیب نہیں ہوا اور انشا کے بیان کے مطابق لکھنؤ کو یہ منزلت اس وقت حاصل تھی جب اس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی اور ناسخ کی بدولت تو یہ دولت عام ہو گئی۔ حضرت غالب سمجھی اس کی تصدیق کرتے ہیں:
> ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا اس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہو گئی۔"(۲)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No3,2024

دنیا کی کوئی بھی زبان ہو،وہ اپنا مرکز یا مراکز ضرور رکھتی ہے۔اردو زبان کو بھی شہروں کی سطح پر کئی ایک مراکز ملے جن میں دہلی اور لکھنؤ نمایاں ہیں۔اسی نسبت سے دو دبستان یعنی دبستان دہلی اور دبستانِ لکھنؤ بھی بہت مشہور ہیں۔دیگر دبستان اردو میں سے زیادہ تر ''دبستانِ لکھنؤ'' کا اتباع کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> ''اردو دہلی اور لکھنؤ کی بول چال کا نام ہے وہیں کے لوگوں کے محل استعمال کو پیشِ نظر رکھ کے محاوروں اور لفظوں کے معنی اور صرف و نحو کے قاعدے بنائے گئے ہیں جن کی پابندی سے ہم کو مفر نہیں۔''(۳)

لکھنو والوں کی زبان دانی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس ضمن میں خاص طور سے ان کی مزاج پرسی کے حوالے سے الفاظ و تراکیب کا درج ذیل اقتباسات میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے:

> ''اردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اتنے ہی درجے نہیں بل کہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور ان کا صحیح استعمال جس قدر اہلِ لکھنؤ جانتے ہیں کس دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے۔
>
> مزاج پرسی کو دیکھیے ہر زبان میں اس کے لیے معمولی الفاظ ہیں مگر اردو میں ادب واحترام کی نگہ داشت کے لیے مزاج عالی۔مزاج مبارک،مزاج اقدس،مزاج معلی وغیرہ کہ کے معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر میں پھیل رہے ہیں مگر ان کے استعمال میں جو اجتہادی ملکہ شرفاے لکھنؤ کو حاصل ہے کسی اور جگہ کے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتا۔''(۴)

اردو میں اگر کسی دبستان کی زبان کی سب سے زیادہ تقلید ہوئی ہے تو وہ ''دبستانِ لکھنؤ'' ہے جس کے الفاظ و تراکیب،روز مرہ و محاورات کو دیگر دبستانوں میں برتا گیا۔اگرچہ ''دبستانِ دہلی'' کی زبان بھی ٹکسالی زبان کا درجہ رکھتی ہے مگر عہدِ حاضر میں دبستان مذکور اوّل کا اتباع عموماً کیا جاتا ہے:

> ''میرا خیال ہے کہ ہر جگہ کے لوگوں نے تحریر میں لکھنؤ کی زبان اختیار کی لہٰذا اس میں ایک حد تک یکسانی پیدا ہو گئی اور تقریری زبان کو تقریری ترتیب میں بالکل لکھنؤ کے مطابق کر لیا کیوں کہ مطلب کا صاف طور سے ادا ہونا اس کے اختیار پر مجبور کر دیتا تھا۔اس طرح ہر جگہ کی زبان کو لکھنؤ کی زبان نے متاثر کر کے اپنا مقلد بنالیا۔لیکن بہت سی مقامی لفظیں اور محاورے ہر جگہ کی تقریری زبان میں رہ گئے۔''(۵)

لکھنوی تہذیب و تمدّن میں تکلف و تصنع کو ایک دوسرے کا مترادف خیال کیا جاتا ہے۔لکھنوی شعر و ادب سے اس کی باضابطہ طور سے تائید ہوتی ہے۔اس میں فصاحت کے بجائے بلاغت،سادگی و سلاست کے بجائے تصنع اور ''آہ'' کے بجائے ''واہ'' کی کیفیت ملتی ہے:

> ''تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب و معاشرت کا مترادف سمجھا جاتا ہے،لکھنؤ کے شعر و ادب سے اس کی تائید ہوتی ہے،شعرائے لکھنؤ نے اپنی تمام تر توجہ شعر کی ظاہری صورت یعنی بیان کی اصلاح میں صرف کی ہے۔لکھنوی شعرا کے طبقہ اوّل میں ناسخ کو استاد سمجھا جاتا ہے ان کا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اودئے معلّٰی کو اردوئے مطلا بنادیا۔فصاحت کی جگہ بلاغت،سلاست و سادگی کی جگہ تصنع اور 'آہ' کی جگہ 'واہ' کو شاعری کی جان بنادیا۔جب جذبات نگاری کو محض ثانوی درجہ دے دیا گیا تو خارجی مضامین کے بیان کو قدرتی طور پر فروغ ہوا۔''(۶)

شاعری میں تصنع اور جذبات نگاری میں لفظی شعبدہ بازی کے ملاپ سے لکھنؤ والوں نے ایک نیا انداز پیدا کر دیا۔ رعایتِ لفظی، تشبیہ، استعارہ میں تحلیلی تراکیب پر توجہ صرف کی گئی۔ شعراے فارسی کی ایک خصوصیت خیال آفرینی کو دبستانِ لکھنؤ کی ایک مستقل صفت بنا دیا گیا:

"شاعری اور صنعت گری جذبات نگاری اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر لکھنوی شعرا نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ ہر رنگ کی نمایاں خصوصیت صنعت ہی کو ٹھہرایا گیا۔ رعایت لفظی یا ضلع جگت جو اول الذکر کی ایک بد نما شکل تھی اسی کے باعث ظہور میں آئی۔ تشبیہ اور استعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے تشبیہ در تشبیہ یا پھر تشبیہوں کے اجزا کی تحلیلی ترکیب پر توجہ کی گئی۔ چوں کہ غزل کے اشعار میں مثنوی کی سی طوالت عموماً ناپسند کی جاتی تھی اس لیے ایک نئے انداز میں دو غزلے سہ غزلے چو غزلے لکھنے کا رواج ہوا۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بہ طور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنؤ کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوئی کے مسلک میں داخل کیا تھا اور یہاں آ کر ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔"(۷)

لکھنؤ میں ہندی اور اردو دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اردو کو یہاں صدیوں سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ جب دہلی کے حالات بگڑے تو بہت سے شاعروں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ تب سے اردو شاعری کے دو ٹھکانے ہو گئے، دہلی اور لکھنؤ۔ دہلی صوفی شاعری اور لکھنؤ غزل، عیش و آرام اور عشقیہ شاعری کا مرکز بنا۔ نوابوں کے دور میں اردو کی خصوصی نشو و نما ہوئی اور یہ ایک خاص تہذیب کی نمائندہ زبان کے طور پر ابھری۔ یہاں کے مشہور شاعروں میں حیدر علی آتش، امیر مینائی، مرزا محمد ہادی رسوا، مصحفی، انشا، صفی لکھنوی، میر تقی میر شامل ہیں۔ لکھنؤ شیعہ ثقافت کے حامل عظیم شہروں میں سے ایک ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی مشہور ہے۔

فرنگی محل، خاندانِ اجتہاد، سلطان المدارس، نویستہ، جھوائی ٹولہ، اودھ پنچ اور مطبع نول کشور جیسے مراکز علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ ادبی اور ثقافتی اجتماعات میں مشاعرے، صوفیائے کرام کے مزارات اور مجالسِ مرثیہ خوانی کا ذکر ضروری ہے۔ قدیم عزاداری کے ضمن میں محرم و چہلم، شاہی اور عوامی تعزیے، محرم اور چہلم کے جلوس، مجالس و خواندگی اور تقسیم تبرک اہمیت کے حامل ہیں۔

"دبستان لکھنؤ" سے مراد شعر و ادب کا وہ رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعراے متقدمین نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ قدیم اردو شاعری اور دہلوی شعر و ادب سے مختلف ہے۔

عیش و نشاط، امن و امان اور شان و شوکت کے اس ماحول میں فنون کا ارتقا ہوا۔ راگ رنگ اور رقص و سرور کے علاوہ شعر و شاعری کو بھی قبولِ عام کا درجہ ملا۔ دربار کی سرپرستی میں شعر و سخن کی محفلیں جا بجا برپا ہونے لگیں۔ امرا، روسا اور عوام سب مشاعروں کے دیوانے تھے۔ مصحفی اور انشا کے عہد تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور لکھنؤ کی خارجیت اور رعایتِ لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں لیکن آہستہ آہستہ لکھنؤ کی اپنی خاص زبان اور لب و لہجہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ یوں ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی جس نے اردو ادب کی تاریخ میں "دبستان لکھنؤ" کے نام سے شہرت پائی۔

دبستانِ لکھنؤ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہاں کی شاعری میں نشاطیہ عنصر ہے جو لکھنؤ کی پُر امن زندگی اور خوشحالی کا عطیہ ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں عورت کے حسن، اس کے زیور اور لباس کا بھرپور بیان ملتا ہے۔ لکھنوی شاعری میں تصوّف کے مضامین ناپید ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری زبان کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش اور پرکشش ہے۔ زبان کے سلسلے میں لکھنؤ والوں نے اہل دہلی سے اپنا راستہ الگ نکالا۔ شعراے لکھنؤ نے جذبات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک سنوارنے اور زبان میں لطافت پیدا کرنے پر زور دیا۔ اس سے دبستانِ لکھنؤ کی زبان زیادہ دلآویز ہو گئی۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No3,2024

لکھنؤ کے نمائندہ شعرا میں نمایاں نام شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی (1141ھ۔1240ھ مطابق 1747ء۔25۔1824ء) کا ہے جنکا شمار دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آنے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مزاج دہلی میں صورت پذیر ہوا لیکن لکھنو کے ماحول، دربار داری کے تقاضوں اور سب سے بڑھ کر انشا کے ساتھ معرکوں نے انھیں لکھنوی طرز اپنانے پر مجبور کیا۔ مصحفیکی جذبات نگاری میں میر کے رنگ کے ساتھ ساتھ جرات اور انشا کا انداز بھی ملتا ہے۔ یوں دہلویت اور لکھنویت کے امتزاج نے شاعری میں شیرینی، نمکینی پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف جنسیت کا صحت مندانہ شعور ہے تو دوسری طرف تصوف اور اخلاقی مضامین بھی ان کے کلام کا حصہ ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے
وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں
تیرے کوچے میں اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

سید انشاء اللہ خان انشاء (1141ھ۔1240ھ مطابق 1747ء۔25۔1824ء) کی ذہانت اور جدت پسندی نے انھیں اپنے ہم عصروں میں نہ صرف انفرادیت عطا کی بل کہ تاریخ ادب میں بھی ممتاز مقام دلایا۔۔ غزل، ریختی، قصیدہ، اردو میں بے نقط دیوان، "رانی کیتکی کی کہانی" جس میں عربی، فارسی کا ایک لفظ نہ آنے دیا۔ انشا پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے "دریائے لطافت" کے نام سے زبان و بیان کے قواعد کو موضوعِ بحث بنایا۔ انشا نے غزل میں الفاظ کے متنوع استعمال سے تازگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے غزل میں مزاح کی نئی طرح ڈالی۔ زبان میں دہلی کی گھلاوٹ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ نمونہ کلام دیکھیے:

گر نازنیں کہے کا برا مانتے ہیں آپ
میری طرف دیکھیے میں نازنیں سہی
لے کے اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

شیخ قلندر بخش جرأت (1162ھ۔1224ھ مطابق 1749ء۔1809ء) دہلی میں پیدا ہوئے۔ دبستان دہلی کی اہم ترین خصوصیت معاملہ بندی ان کی شاعری کا مخصوص رنگ ہے۔ روایت ہے کہ شریف زادیوں سے آزادنہ میل ملاپ اور زنان خانوں میں بے جھجک جانے کے لیے خود کو اندھا مشہور کر دیا لیکن ان کے نابینا ہونے کے شواہد سے بھی انکار ممکن نہیں۔ جرات کی غزل کی عورت خود لکھنؤ ہی کی عورت ہے۔ زبان میں سادگی کے باعث جنس کا بیان واضح اور دو ٹوک قسم کا ہے۔ شاید یہی وہ ہے کہ حسن عسکری نے انھیں مزے دار شاعر کہا ہے۔ نمونے کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کل وقت راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرات کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No3,2024

کیا جانیے کم بخت نے کیا مجھ پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

خواجہ حیدر علی آتش(1192ھ مطابق1778ء۔1846ء) فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ طبیعت میں قناعت اوراستغنا کا مادہ موجود تھا۔ کسی دربار سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے کسی کی مدح میں انھوں نے کوئی قصیدہ گوئی نہیں کی۔ آتش کی شاعری لکھنؤ کی پروردہ ہے لیکن اسے پروان چڑھانے والے ایک دہلوی استاد غلام ہمدانی مصحفی ہیں۔ یوں ان کے کلام میں دہلوی اور لکھنوی دبستانوں کی خصوصیات کا امتزاج پیدا ہو گیا۔ آتش و ناسخ کے ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ناقدین نے آتش کو ناسخ پر فوقیت دی اور انھیں لکھنؤ دبستان کا نمائندہ شاعر قرار دیا۔ ان کے اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات کا بر محل استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ آتش کا نظریہ بھی یہی تھا:

بندشِ الفاظ جڑنے میں نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کے کلام کی اہم خصوصیات میں نشاطیہ انداز، صفائی اور محاورات کا بہترین استعمال ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری روایتی انداز سے ہٹ کر ہے جس میں رجائیت کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ نمونے کے طور پر درجِ ذیل اشعار دیکھیے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تیری آواز کا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

شیخ امام بخش ناسخ(1158ھ۔1254ھ مطابق1772ء۔1838ء) کی شاعری جذبات واحساسات سے عاری ہے۔ انھوں نے مشکل زمینوں، ان مل قوافی اور طویل ردیفوں کے بل پر خود کو استاد تسلیم کروایا۔ ان کی اہمیت زبان کی صفائی اور متروکات کی باقاعدہ مہم چلانے کے باعث ہے۔ زبان و بیان کے قوانین کی نہ صرف خود پیروی کی بلکہ اپنے شاگردوں سے ان کی پابندی کرائی۔ یوں اردو غزل کی زبان کو جھاڑ جھنکار سے پاک صاف کرنے کے حوالے سے ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ مولوی عبد الحق ان کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ناسخ بلاشبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کا ناسخ اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں۔ ان کے کلام میں نہ نمکینی ہے نہ شیرینی۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستان پیدا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی
دل ہی دل میں ہم اسے یاد کیا کرتے ہیں

خارجیت اور بیروں بینی، تکلف، فکر وخیال میں گہرائی کا نہ ہونا، رنگین بیانی، مضمون آفرینی، معاملہ بندی، سراپا نگاری، رعایت لفظی: طویل غزلیں، قافیہ پیمائی، بے میل قافیہ وردیف، پیچ دار تشبیہ اور استعارے کا استعمال، نسائیت، سوز و گداز جیسی خصوصیات دبستانِ لکھنؤ کا طرۂ امتیاز ہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No3,2024

انیسؔ کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کی خود مختاری کو کبھی پوری طرح تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنے خاندان کے بعض محاورات کو زندہ رکھا۔ ناسخؔ لکھنؤ کی پہلی ادبی شخصیت ہے جس کی وجہ سے لکھنؤ کی غزل حقیقی تغزل سے دور ہوتی گئی۔ میرؔ کی عظمت کو مانتے ہوئے میرؔ کو نظر انداز کرتی گئی۔ مختصر ہونے کے بجائے طویل بن گئی اور قافیہ پیمائی کو زیادہ ضروری سمجھتی گئی۔ وزیرؔ، بحرؔ، مہرؔ، امانتؔ، امیرؔ کے یہاں یہ سامان آرایش ہے اور رندؔ و تعشق (جو ناسخؔ کے شاگرد تھے) شوقؔ اور صباؔ کی چنگاریوں کے باوجود اس میں خس و خاشاک زیادہ ہے، لیکن مرثیے اور مثنوی میں اس نے جو اضافے کیے ہیں وہ اردو کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں تو صیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

لکھنؤ کی ساری مثنویوں (بہ شمول مثنوی "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم") میں سب سے زندہ، روشن اور تھرتھراتی ہوئی تصویریں شوقؔ کی مثنویوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ "زہر عشق" میں عشق کے معیار کو پا کر آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ لکھنؤ کی تہذیب میں کیا کیا عناصر در آئے تھے۔

لکھنوی نثر کا پہلا شہ کار رجب علی بیگ سرورؔ کا "فسانۂ عجائب" ہے جس کی تحسین بشن نراین در، چکبستؔ، عسکریؔ اور دیگر ناقدین نے کی ہے۔ حالانکہ اس میں طلسم ہوش ربا کا سا پھیلاؤ اور جادو ہے اور نہ باغ و بہار جیسی دل کشی اور دل آویزی۔

لکھنوی تہذیب کی زندہ دلی اودھ پنچ میں نمایاں ہوتی ہے اور باوجود اس کے کہ اودھ پنچ کی نثر میں اعلیٰ ظرافت کی پھوار کم ہے جب کہ چھیڑ چھاڑ، ہنسی اور قہقہے کی بوچھار زیادہ۔ مگر یہ سرورؔ کی مقلد ہو کر بھی سرورؔ سے زیادہ زندہ ہے۔

سرشارؔ کی نثر بھی شاعرانہ اور رنگین ہے مگر وہ لکھنؤ کی پہلی بڑی کوشش ہے جو بول چال سے زیادہ قریب اور قافیے کی موسیقی سے بے نیاز ہے۔ ان کی نثر چست نہیں مگر آزاد افسانے کے لیے موزوں ہے۔

شررؔ اور رسواؔ بھی لکھنؤ کی تہذیب کی مصوری کرتے ہیں مگر وہ بھی اس صف میں شامل ہو چکے ہیں جو لکھنؤ اور دہلی کی آمریت سے ادب کو آزاد کر رہی ہے۔ سرشارؔ بھی نئی صف کے قریب ہیں مگر وہ اس قدر جدید نہیں جتنے شررؔ اور رسواؔ۔ شررؔ نے ایک طرف علی گڑھ تحریک کی ذہنی قیادت کو قبول کیا اور دوسری طرف بعض لکھنوی خصوصیات کو کلیجے سے لگائے رکھا۔

رسواؔ ذہنی اعتبار سے جدید ہیں۔ امراؤ جانؔ ادا ایک جدید ناول ہے۔ اس کا نظم و ضبط، اس کی مصوری، اس کی واقعیت، اس کا فن جدید ہے۔ رسواؔ معلم اخلاق نہیں بننا چاہتے اور جہاں وہ اخلاقیات بگھارنے لگتے ہیں، وہاں فن کار نہیں رہتے۔ یعنی نظم میں شوقؔ قدوائی اور چکبست کے وقت سے اور نثر میں شررؔ اور رسواؔ کے زمانے سے لکھنؤ اسکول کی آمریت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ کے شاعر صفیؔ، ثاقبؔ عزیزؔ، اثرؔ، میر و غالبؔ کو لکھنؤ کے زبان دانوں سے بڑا درجہ دیتے ہیں اور لکھنؤ کے نثر نگار، مضامین، رسالوں، کتابوں اور اخباروں کے ذریعے سے دوسروں کی طرح ایک پڑھے لکھے حلقے کو اپنا ہمنوا بنانا چاہتے ہیں یعنی ادب سے ایک کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔

ماتمی سے امیرؔ و جلالؔ تک بہت ادبی ہوتی تھی، مگر لکھنؤ کی رہی سہی رونق کے رخصت ہو جانے پر، لکھنویت کے طنزیاتی تیروں کے بے کار ہو جانے پر جاگیر دارانہ تہذیب کا ماتم، میرؔ کی یاسیت کی آڑ لے کر الفاظ میں اتر آیا۔ عزیزؔ اور ثاقبؔ، غالبؔ کے خیال کو میرؔ کی زبان میں ادا کرنا چاہتے تھے۔ عزیزؔ و ثاقب کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No3,2024

شاعری اس لے میں بالکل ڈوبی ہوئی ہے۔ صفیؔ اور اثرؔ کے یہاں یہ رنگ کم ہے۔ صفیؔ شروع سے قومی تحریکوں سے وابستہ رہے۔ اس تعلق نے انھیں نئی امیدوں اور آرزوؤں سے آشنا ہونا سکھایا۔ اس کی وجہ سے چکبستؔ میں وطنی، قومی اور سیاسی شاعر کی عظمت ملتی ہے۔ اثرؔ کے مزاج میں لطافت انھیں عزیزؔ کے رنگ میں غرق نہ کر سکی۔ ان کی تعلیم اور ملازمت نے انھیں لچکدار ذہن دیا۔ فیضان(Inspiration) کے لیے وہ میرؔ ہی کی طرف واپس گئے۔

ادب میں ہیرو پرستی کی طرح ''دبستان پرستی'' بھی بری چیز ہے۔ لکھنؤ میں یہ دونوں چیزیں بہت نمایاں رہیں اور یہ دونوں ایک حد سے بڑھنی نہیں چاہییں۔ لکھنؤ اسکول کے سارے ادبی کارناموں پر نظر ڈالنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ادب میں بڑائی صرف فن پر جلا کرنے سے نہیں آتی، فن کو زندگی کی بڑی صالح اور ترقی پذیر قوتوں کا خادم بنانے سے آتی ہے۔ فن پر زیادہ توجہ زندگی سے بڑی حد تک گریز کا نتیجہ ہے اور جب فن پر یہ توجہ، وسعت، عمومیت، توانائی، زور، جوش اور جذبہ پیدا کرنے کے لیے نہیں، نرمی، نزاکت، نفاست، لوچ اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے ہو تو یہ فن کی پرستش اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادب کو محض شاعری یا ساحری بنانا ادب کے بحر بے کراں کو جوئے کم آب میں تبدیل کرنا ہے۔ اسے تعلیم اور سیاست، تاریخ اور سوانح عمری، تنقید اور تبصرے سے لے کر سائنس، اقتصادیات اور نفسیات تک سے اپنا مواد لینا چاہیے اور اپنے طور پر 'پیمبری' بھی کرنا چاہیے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ محمد باقر شمس، لکھنؤ کی زبان، کراچی، اکیڈمک پریس، ۱۹۳۸، ص ۶۲

۲۔ ایضاً، ص ۷۷۔۷۶

۳۔ ایضاً، ص ۸

۴۔ ایضاً، ص ۲۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۶۔ ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۴۴ء، ص ۴۳

۷۔ ایضاً، ص ۶۰